محمد جعفر پھلواروی

روایت و درایت

اہل اسلام نے فی الواقع تاریخ کو ایک عظیم فن بنا دیا ہے اور اس میں وہ دنیا کی تمام اقوام میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ مسلمان قوم سے پہلے تاریخ دراصل کوئی فن ہی نہ تھی۔ زیادہ تر دیومالائی افسانوں کا مجموعہ تھا جسے تاریخ کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے دو اصولوں کا اضافہ کرکے تاریخ کو فی الواقع ایک کارآمد اور قابلِ اعتماد فن بنا دیا۔ ایک ہے اصولِ روایت اور دوسرا اصولِ درایت۔ روایت سے مراد یہ ہے کہ فلاں بات کن کن راویوں کی وساطت سے ہم تک پہنچی ہے۔ وہ بیان کرنے والے اپنی امانت، دیانت، فہم اور حافظہ وغیرہ کے لحاظ سے قابلِ اعتماد ہیں بھی یا نہیں۔ انھیں راویوں کے سلسلے کو سند کہتے ہیں۔ راویوں کے حالات معلوم کرنے میں بشری امکانات کی حد تک بڑی کاوشوں اور تحقیق و تفحص سے کام لیا گیا ہے اور اس پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں جنھیں کتبِ رجال کہتے ہیں۔ پھر سلسلہ رواۃ کی صحت و سقم کے لحاظ سے روایت کی بہت سی قسمیں متعین کی گئیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کون سی سند کس حد تک قابلِ قبول، یا لائقِ ردّ ہے۔

دوسرا اصول درایت ہے جس کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ ایک سند یعنی سلسلہ رواۃ کی وساطت سے جو بات بیان کی جا رہی ہے وہ عقلی کسوٹی پر بھی پوری اترتی ہے یا نہیں؟ ہمارے خیال میں اصل چیز درایت ہی ہے۔ راویوں کو قبول یا ردّ کرنے کے جو اصول وضع کیے گئے ہیں وہ بھی دراصل درایت و عقل ہی کے تقاضے ہیں۔ یہ کوئی الگ چیز نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اصل کسوٹی درایت و عقل ہی ہے جو ایک طرف سند کو پرکھتی ہے اور دوسری طرف متن کو۔

یہاں ایک بات کو صاف کر لینا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ سند و متن کو پرکھنے کے لیے عقل ہی ایک کسوٹی نہیں۔ ایک چیز اس پر بھی مقدم ہے اور وہ ہے نقل۔ نقل سے ہماری مراد یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ مضمون روایت قرآن مجید کے مطابق ہے یا نہیں؟ عقل کچھ بھی کہے اگر کوئی بات صریحاً قرآن یا اس کی عمومی اسپرٹ کے خلاف ہو تو وہ خواہ کیسی مستند کتاب میں ہو اور کیسی ہی قوی ترین سند سے ہو وہ قابل قبول نہیں۔ ہم نے روایات کو قرآن اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر مانا ہے۔ روایات کے لیے قرآن و صاحب قرآن کو نہیں مانا ہے۔ اگر ہمیں کہیں قرآن اور روایت میں تناقض کی جھلک نظر آئے تو ہم روایت کو بچانے کی خاطر قرآنی مضمون کو توڑ مروڑ نہیں کریں گے۔ ہاں روایت کا احترام کرتے ہوئے خود روایت کی تاویل کرلیں گے اور اگر معقول تاویل نہ ہو سکے تو اسے رد کرنے کو ترجیح دیں گے۔ اور سچ پوچھیے تو قرآن کے مطابق روایات کو قبول کرنا یا مخالف قرآن کو رد کرنا بھی عین عقل ہی کا تقاضا اور درایت ہی کا اقتضا ہے۔ قرآن سراپا عقل و حکمت ہے اور صاحب قرآن ہی نے ہمیں سب سے زیادہ عقل و حکمت کی تعلیم دی ہے۔ اس لیے جو روایت خلاف قرآن ہو وہ خلاف عقل بھی ہوگی۔ اور سب سے بڑی اور اہم بات تو یہ ہے کہ خود صاحب قرآن نے روایت کو پرکھنے کے لیے جو کسوٹی دی ہے وہ یوں ہے:

تکثر لکم الاحادیث بعدی، فما	میرے بعد تمہارے سامنے حدیثیں بکثرت آئیں گی۔
روی لکم حدیث عنی فاعرضوہ	لہٰذا میری جو حدیث تمہارے سامنے روایت کی جائے
علی کتاب اللہ، فما وافقہ فاقبلوہ	اسے قرآن کے سامنے پیش کرو۔ پھر جو اس کے مطابق
وما خالفہ فردوہ۔	ہو اسے قبول کرلو اور جو اس کے خلاف ہو اسے رد کردو۔

لطف کی بات یہ ہے کہ یہ فرمان نبوی اصول کافی میں بھی ہے اور مسند احمد میں بھی۔ یعنی شیعہ وسنی دونوں کی متفق علیہ ہے۔ اور اس سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ روایت پہلے صحیح بخاری میں موجود تھی اور اب نہیں ہے۔ علامہ تفتازانی کے عہد تک یہ حدیث صحیح بخاری میں موجود تھی جسے

انھوں نے توضیح تلویح میں بحوالۂ صحیح بخاری نقل فرمایا ہے۔ بعض قلمی نسخوں میں (اور اب سنا ہے کہ بعض مطبوعہ نسخوں میں بھی) یہ روایت موجود ہے۔ لیکن پانچویں صدی سے اب تک کے متداول نسخوں میں یہ روایت کہیں درج نہیں ہو سکی۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ کسی روایت کو پرکھنے کے لیے سب سے اولین کسوٹی قرآن مجید ہی ہے اور یہ کسوٹی بھی عین عقلی ہی کسوٹی ہے۔ یہ فیصلہ بھی عقل ہی کرے گی کہ فلاں روایت قرآن اور اس کی عمومی اسپرٹ یا صاحب قرآنؐ اور ان کے مزاج کے مطابق ہے یا نہیں؟

تاریخی روایات کو یکجا کرنے میں بلاشبہ مسلمانوں نے بڑا کردار ادا کیا ہے اور بقدر طاقت بشری ان کسوٹیوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں یعنی عقل و نقل دونوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہ تمام حضرات اپنی سعی بلیغ کے لیے ہمارے شکریوں کے مستحق ہیں۔ اگر انھوں نے اتنی جاں فشانی و محنت نہ کی ہوتی تو ہم آج بہت سے دینی و تاریخی مواد سے محروم رہ جاتے۔ اس اعتراف کے باوجود اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ یہ حضرات بے خطا اور معصوم نہ تھے۔ ان سے بھی کچھ تسامحات ضرور ہوئے ہیں اور اگر آج کوئی شخص ان تسامحات کی نشان دہی کرے تو وہ محض اس لیے ناقابلِ اعتنا یا مستحقِ ملامت نہیں ہوسکتا کہ وہ چند صدی پہلے کیوں نہیں پیدا ہوا۔ کہنے والا آج جو کچھ کہتا ہے اس پر غور کیجیے اگر اس کی بات عقل و دیانت کے مطابق نظر آئے تو مان لیجیے ورنہ اسے رد کر دیجیے۔ لیکن کسی کو بدنیت قرار دے کر اسے رد کر دینا اور اسے حقِ تنقید سے محروم کر دینا کوئی صحیح اسلامی روش نہیں۔

ہمارے مورخین سے بعض ایسی غلطیاں بھی ہوئی ہیں جن کی اصلاح مفید ہی ہے مضر نہیں۔ مثلاً یہی کہ ہم لکھتے ہیں تاریخ مسلمین اور اسے نام دیدیتے ہیں تاریخ اسلام کا۔ ہماری تاریخ، تاریخ مسلمین بھی تو نہیں ہوتی۔ صرف فرمانروایان و امرا کی تاریخ ہوتی ہے اور اس کا نام رکھا جاتا ہے تاریخ اسلام۔ گویا اشرارِ بنی امیہ و بنی عباس و بنی فاطمہ وغیرہ تو تاریخ اسلام میں داخل ہیں اور علماء و صوفیا و مجتہدین تاریخِ اسلام سے باہر ہیں۔ لہٰذا اگر ان کے

متعلق کچھ لکھنا ہو تو تاریخِ علما، تاریخ صوفیا اور تاریخ ائمہ وغیرہ الگ لکھی جاتی ہے۔

دوسری غلطی یہ ہوئی کہ جہاں منافقین نے شر و فتنہ پھیلانے کی نیت سے بعض جھوٹی روایات کو غلافِ تقدس میں لپیٹ کر ہر طرف پھیلا دیا وہاں بعض مخلص عقیدت مندوں نے بھی اپنی سادہ لوحی سے بعض مبالغہ آمیز روایتیں درج کرنے میں زیادہ فکر و غور سے کام نہ لیا۔ مثلاً اسحاق اسفرائنی نے لکھا ہے کہ جناب حسینؓ بن علیؓ ہر شب ایک ہزار نفل پڑھا کرتے تھے۔ کیا اس سے بھی زیادہ خلافِ عقل کوئی بات ہو سکتی ہے؟ اگر انتہائی عجلت سے بے دلی کے ساتھ بھی نماز ادا کی جائے تو فی رکعت ایک منٹ سے کیا کم لگے گا؟ ظاہر ہے کہ ایک ہزار منٹ کی عرب میں کوئی رات کبھی نہیں ہوئی۔ پورے چوبیس گھنٹے کے ۱۴۴۰ منٹ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عرب میں کوئی دن صرف ۸۴۰ منٹ کا اور کوئی رات ایک ہزار منٹ کی نہیں ہوتی۔

تیسری غلطی ہمارے مورخین کی وہ ہے جسے "مکھی بہ مکھی" کہتے ہیں۔ یعنی ابتدا میں کسی نے کوئی غلطی کی اور بعد کے مورخین اسے اسی طرح مکھی بہ مکھی نقل کرتے چلے جاتے ہیں اور درایت سے کام نہیں لیتے۔ اس کی ایک مثال سن لیجیے۔ معتصم باللہ کے متعلق طبری لکھتا ہے کہ اسے چند باتوں کی وجہ سے مثمن (یعنی آٹھ کے ہندسے کا حامل) کہا جاتا ہے۔ وہ باتیں یہ ہیں۔ حضرت عباس کی آٹھویں پشت میں تھا۔ آٹھواں عباسی خلیفہ تھا۔ ۱۸ سال کی عمر میں خلیفہ ہوا۔ آٹھ سال آٹھ ماہ خلافت کی۔ ۴۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اسلامی سال کے آٹھویں مہینے یعنی شعبان میں پیدا ہوا۔ آٹھ بیٹے اور آٹھ بیٹیاں چھوڑیں۔ آٹھ جہاد کیے۔ اسی لاکھ درہم ترکے میں چھوڑے۔

ذرا غور فرمایئے کہ یہ تین باتیں ایک ساتھ درست ہو سکتی ہیں کہ ۱۸ سال کی عمر میں خلیفہ ہوا۔ آٹھ سال آٹھ ماہ خلافت کی مدت رہی۔ ۴۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اگر اٹھارہ سال کی عمر میں خلیفہ ہوا اور آٹھ سال آٹھ ماہ خلیفہ رہا تو مرتے وقت اس کی عمر ۲۷ سال کے

لگ بھگ ہوگی۔ اور اگر اس کی عمر ۴۸ سال کی تھی تو مدتِ خلافت کوئی نیس سال ہوتی ہے۔ اور اگر آٹھ سال آٹھ ماہ مدت خلافت اور عمر ۴۸ سال تھی تو تخت نشینی کی عمر تقریباً ۳۹ سال ہو ہوتی ہے۔ بہر حال یہ تینوں باتیں ایک ساتھ درست نہیں ہو سکتیں۔ لیکن چونکہ طبری کے کسی راوی یا غالباً طباعت کی غلطی سے کچھ کا کچھ ہو گیا اس لیے اسی کو ابن طقطقی نے الفخری میں نقل کر دیا اور زیادہ تعجب یہ ہے کہ ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن ایم اے پی ایچ ڈی (لندن)، ڈی لٹ (پیرس)، صدر شعبۂ تاریخ فؤاد اول یونیورسٹی قاہرہ نے بھی اپنی شہرۂ آفاق کتاب تاریخ الاسلام السیاسی میں بعینہٖ یہی عبارت نقل کر دی ہے۔ یہی ڈاکٹر صاحب اپنی اسی کتاب میں معتصم کا سنہ ولادت ۱۷۸ھ لکھتے ہیں اور تخت نشینی کا ۹ رجب ۲۱۸ھ اور وفات ۱۹ ربیع الاول ۲۲۷ھ بتاتے ہیں۔ گویا معتصم تقریباً چالیس سال کی عمر میں خلیفہ ہوا تھا نہ کہ ۱۸ سال کی عمر میں۔ بات صرف اتنی ہے کہ اس کا سنہ ولادت اور سنہ تخت نشینی دونوں میں آٹھ کا عدد آتا ہے۔

الفخری کا اردو ترجمہ کرتے وقت مجھے یہ بات کھٹکی تھی اس لیے میں نے وہیں لکھ دیا ہے کہ عمرِ تخت نشینی، مدتِ خلافت اور عمرِ وفات کی تینوں باتیں ایک ساتھ صحیح نہیں ہو سکتیں۔

ایک ضروری تصحیح

معاصر "جامعہ" (دہلی) کے سالنامہ (اشاعت فروری ۱۹۶۲ء) میں ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب نے اپنے مضمون میں علامہ اقبال کے "جاوید نامہ" کے انگریزی ترجمہ کو کسی "عبدالکریم خاں" سے منسوب کر دیا ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ یہ ترجمہ بزم اقبال نے شائع کیا ہے۔

یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ "جاوید نامہ" کا انگریزی ترجمہ (PILGRIMAGE OF ETERNITY) پروفیسر محمود احمد (پرنسپل گورنمنٹ کالج میرپور) نے کیا ہے اور اسے ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور نے شائع کیا ہے۔

ایم۔ اشرف ڈار، سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

مطبوعاتِ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ ۱۹۵۰ء میں اس غرض کے لیے قائم کیا گیا تھا کہ دورِ حاضر کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اسلامی فکر و خیال کی از سرِ نو تشکیل کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو موجودہ حالات پر کس طرح منطبق کیا جا سکتا ہے۔ اس ادارہ کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اسلام ایک ارتقا پذیر تصورِ حیات ہے جس کی بنیادیں اٹل اور ناقابلِ تغیر ہیں لیکن جن کے تفصیلی قوانین میں بلحاظ حالات ترمیم و تبدیلی ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ ایسی ترمیمات اور تبدیلیاں انہی اصولوں پر مبنی ہوں جو بنیادِ اسلام ہیں۔ اس طرح یہ ادارہ دین کے اساسی تصورات اور کلیات کو محفوظ رکھتے ہوئے ایک ایسے ترقی پذیر اسلامی معاشرہ کا خاکہ پیش کرتا ہے جس میں ارتقائے حیات کی پوری پوری گنجائش موجود ہو۔ اور یہ ارتقاء انہی خطوط پر ہو جو اسلام کے متعین کردہ ہیں۔

اس ادارہ میں کئی ممتاز اہلِ قلم اور محققین تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہیں، جو زندگی کے مختلف مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر سے غور و فکر کرتے ہیں۔ ان حضرات کی لکھی ہوئی کتابیں ادارہ سے شائع کی گئی ہیں۔ ان کتابوں کی اشاعت سے اسلامی لٹریچر میں نہایت مفید اور خیال آفرین مطبوعات کا اضافہ ہوا ہے۔ اور ان کو علمی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا ہے۔ ادارہ نے ان مطبوعات کی ایک ایسی فہرست بھی شائع کی ہے جس میں کتابوں کے متعلق تعارفی نوٹ بھی درج ہیں تاکہ ان کی اہمیت و افادیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

فہرست اور ادارہ کی مطبوعات مندرجہ ذیل پتہ سے دستیاب ہو سکتی ہیں:

سیکرٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ

لاہور